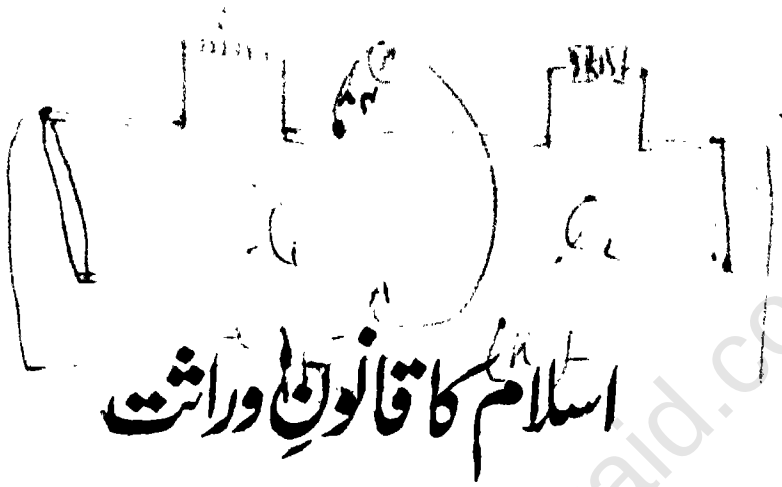




مولانا سید جلال الدین عمری

موجودہ دور میں اسلام کے جن سماجی اور معاشرتی مسائل پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ ان میں اس کا ”قانون وراثت“ بھی ہے۔ اسلام ایک خاص انداز سے خاندان کی تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے اس نے اپنا ایک تفصیلی نظام وضع کیا اور۔ قانون وراثت اسی کا ایک جزو ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے پہلے خاندان کی ساخت، افراد خاندان کے باہمی تعلقات کی نوعیت اور ان کی نفسیات کو سمجھنا ہوگا اس کے بغیر اسلام کے قانون وراثت کی معنویت سمجھ میں نہیں آسکتی۔

خاندان انسانی سماج کا سب سے قدیم اور بہت ہی اہم ادارہ ہے۔ اس کی شکلیں تو زمانہ اور حالات کے لحاظ سے بدلتی رہی ہیں۔ لیکن اس کا وجود ہمیشہ باقی رہا ہے خاندان سے انسان کی بعض بالکل ابتدائی اور بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ خاندان کا کوئی ایسا بدل آج تک وجود میں نہیں آیا جو ان ضرورتوں کو اس سے بہتر طریقہ سے پورا کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ خاندان سے انسان کی وابستگی بھی مسلسل جاری ہے۔ وہ ماضی میں بھی اس سے اپنا تعلق توڑ نہیں سکا۔ اور شاید مستقبل میں بھی اس سے بے نیاز نہیں ہو سکے گا۔

خاندان سے انسان کے تعلق کی وجہ محض یہی نہیں ہے کہ وہ اس کا محتاج ہے۔

بلکہ اس تعلق کی نوعیت جذباتی بھی ہے۔ وہ اس کی ایک سماجی ضرورت بھی ہے۔ اور اس کی فطرت کا تقاضا بھی۔ انسان کو اپنے خاندان سے بے پناہ محبت ہوتی ہے اور وہ اس سے غیر معمولی قرب محسوس کرتا ہے۔ غیروں کے درمیان اس کو اجنبیت کا جو احساس ہوتا ہے۔ خاندان والوں میں پہونچ کر اس کا یہ احساس ختم ہو جاتا ہے۔ ان کی موجودگی اس کی خوشی میں اضافہ کا سبب بنتی ہے اور ان کی جدائی اس کو دل گیر اور مغموم بنا دیتی ہے۔ خاندان سے اس کو اتنی شدید وابستگی ہوتی ہے کہ اس سے اس کو بڑے سے بڑا صدمہ اور تکلیف بھی پہونچ جائے تو بالعموم اس سے وہ اپنا تعلق توڑنا پسند نہیں کرتا۔

افراد خاندان کے درمیان ایک طرح کا "معاہدہ" ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آئیں گے اور ان کے معاون اور مددگار ہوں گے۔ ان کے بڑے ان کے چھوٹوں کی پرورش اور دیکھ بھال کریں گے۔ اور ان کے چھوٹے ان کے بڑوں کی تعظیم اور خدمت بجا لائیں گے۔ خاندان کے نفع و نقصان کو اس کا ہر فرد اپنا نفع و نقصان سمجھے گا اور خاندان کو فائدہ پہونچانے اور اسے نقصان سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ یہ معاہدہ گو الفاظ کی شکل میں موجود نہیں ہوتا لیکن خاندان کا ہر فرد اس سے واقف ہوتا ہے۔ اور اس کی پابندی کو ضروری سمجھتا ہے۔ جب کبھی اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ تو اس کو ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ اور اس پر تنقید کی جاتی ہے خاندان سے اپنے فطری تعلق کی بنا پر انسان افراد خاندان کی خدمت کرتے ہوئے اندان پر اپنی دولت صرف کرتے ہوئے ایک طرح کی خوشی محسوس کرتا ہے بلکہ ایسا وقت وہ اپنی ذات پر خاندان والوں کو ترجیح دیتا ہے۔ اور ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھتا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی خارجی دباؤ نہیں ہوتا۔ بلکہ خاندان سے تعلق اور اس سے محبت اس کو اس پر مجبور کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی معاشی

سماجی اور سیاسی جدوجہد کے پیچھے اس کا ذاتی مفاد پوری قوت کے ساتھ کارفرما ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے کہ اپنے خاندان کی ضروریات پوری کرے اس کے لئے غذا، لباس، مکان اور آسائش و آرام کا سامان فراہم کرے۔ اسے سماجی لحاظ سے اوپر اٹھائے۔ اور اس کو خوشحال اور ترقی یافتہ دیکھے۔ یہ جذبہ نہ ہو تو اس کی دورِ دھوپ کا ایک بڑا محرک ختم ہو جائے گا۔ اور اس کی کوششیں بھم پڑ جائیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ خاندان کی فلاح و بہبود اس کی فلاح و بہبود ہوتی ہے۔ وہ دونوں کو بالعموم ایک سمجھتا ہے۔ اور ان میں بہت کم فرق کرتا ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ خاندان کے تمام افراد سے انسان کا یکساں تعلق نہیں ہوتا۔ جو افراد اس سے فطری طور پر بہت ہی قریب ہوتے ہیں اور عملاً جن کا تعاون اس کو سب سے زیادہ حاصل ہوتا ہے ان سے اس کا تعلق بھی غیر معمولی ہوتا ہے اس کے برعکس جو افراد اس سے جس قدر دور ہوں اس کا تعلق بھی ان سے اتنا ہی کم ہوتا ہے۔ اپنے اسی تعلق کی بنیاد پر وہ خاندان کے افراد کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ دور کے افراد کے مقابلہ میں قریب کے افراد سے اس کو محبت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور وہ ان کے ساتھ ترجیحی سلوک بھی کرتا ہے۔

انسان کے ان ہی فطری جذبات پر اسلام نے خاندانی نظام کی بنیاد رکھی ہے اس نے اہل خاندان کے ساتھ حسن سلوک کی بے حد تعریف کی۔ اور اس کو ایک بڑی اخلاقی خوبی قرار دیا کہ انسان اپنے گھر والوں کے دکھ درد میں کام آئے۔ اور ان کی ضروریات پوری کرے۔ جس شخص میں یہ وصف نہ ہو اور جو اپنے قریب ترین افراد کو بھول جائے۔ اس کی شدید مذمت کی۔ اور اس کو سخت گناہ کا ٹھہرایا۔ کسی بھی نظام کو وجود میں لانے کے لئے محض اخلاقی تعلیم کافی نہیں ہوتی۔ بلکہ قانون کی قوت بھی درکار ہوتی ہے۔ تاکہ اس کی خلاف ورزی سے روکا جاسکے۔

اس میں شک نہیں کہ خاندان کا تعاون انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اور وہ قانون کی سختی کے بغیر بھی بالعموم اس پر عمل کرتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض اوقات وہ اپنے اس فطری داعیہ پر عمل نہیں کر پاتا بلکہ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ اس کے خلاف بغاوت کر بیٹھتا ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے ترغیب و تشویق ہی سے نہیں بلکہ قانون کے زور سے بھی انسان کو اس بات کا پابند بنایا کہ وہ اپنے خاندان والوں کا تعاون کرے۔ اور ان کی ضروریات کی تکمیل کا بوجھ اٹھائے۔ والدین اور اولاد کا تعلق اس کی ایک واضح مثال ہے۔ یہ تعلق بالکل فطری ہے۔ اور انسان بغیر کسی خارجی دباؤ کے اولاد کی پرورش اور خدمت اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے لیکن کبھی کبھی وہ ان قریب ترین افراد کو نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اسلام نے اخلاقی ہدایات کے ساتھ قانون کے ذریعہ بھی والدین اور اولاد کے حقوق محفوظ کردئے ہیں تاکہ نہ تو والدین کو اولاد نقصان پہنچا سکے اور نہ اولاد کو والدین کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے۔

ٹھیک یہی نوعیت وراثت کی ہے۔ وراثت انسان کی فطرت کا ایک بنیادی تقاضا ہے۔ اسلام نے اس فطری تقاضے پر عمل کرنے یا نہ کرنے کی آزادی نہیں دی بلکہ اپنے ماننے والوں کو قانون کے ذریعہ اس کا پابند بنا دیا۔ یہاں ہم پہلے یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ وراثت انسانی فطرت کا کوئی مطالبہ ہے یا نہیں۔ پھر اس

۱۔ بعض لوگ اس بات کا انکار کر سکتے ہیں کہ خاندان انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ موجودہ مغربی سماج نے اس کا جواب دے دیا ہے۔ مغرب کا انسان اپنی کج فکری اور غلط روی کے باعث خاندان کے شیرازہ کو منتشر کر کے جس طرح سکون اور چین سے محروم ہو چکا ہے۔ اس کے بعد خاندان کی ضرورت سے انکار کرنا آسان نہیں ہے۔

کے بعد وراثت سے متعلق اسلام کی تعلیمات کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

یہ ایک حقیقت ہے اور مشاہدہ اس کی تائید کرتا ہے کہ انسان اپنے کنبہ اور خاندان ہی کو اپنا جائز وارث تصور کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں جس طرح اپنے مال و دولت میں غیروں کا حق تسلیم نہیں کرتا اسی طرح وہ اس کو بھی سمجھ نہیں سکتا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی دولت ان افراد کے ہاتھوں میں چلی جائے جن کو وہ اجنبی اور غیر تصور کرتا ہے۔ انسان کے اندر ملکیت کا بہت شدید احساس پایا جاتا ہے۔ اس احساس کو نہ نکالا جاسکتا ہے۔ اور نہ کسی طرح نکالا جاسکتا ہے۔ یہ احساس تقاضا کرتا ہے کہ جو چیز اس کی ملکیت میں ہے اور جس دولت اور سرمایہ کو اس نے محنت اور مشقت سے حاصل کیا ہے اور جس کا وہ جائز تھرا ہے اس پر زندگی بھر اس کا قبضہ رہے۔ اور اس کے بعد یہ ان لوگوں کی طرف منتقل ہو جو زندگی میں سب سے زیادہ اُس سے قریب تھے اور جن کو وہ اپنا عزیز اور رشتہ دار تصور کرتا تھا اس کے بغیر اس کے احساس ملکیت کی تسکین نہیں ہوتی۔ اس تصویر ہی سے اس کو سخت تکلیف پہنچتی ہے۔ کہ جن چیزوں کا آج وہ مالک ہے کل وہ غیروں کے قبضہ میں چلی جائیں گی۔

پھر یہ بھی انسان کی خواہش ہوتی ہے اور اس خواہش کو غلط بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اپنی زندگی میں وہ جن افراد سے قریب رہا اور جو اس کے قریب رہے، جن سے وہ محبت کرتا تھا اور جو اس سے محبت کرتے تھے جن کا معاشی بوجھ وہ اٹھائے ہوئے تھے۔ اور جو اس کی معاشی تنگ و دو میں مدد کر رہے تھے، جن کے دکھ درد کو وہ اپنا دکھ درد سمجھتا تھا اور جو اس کے دکھ درد میں شریک تھے، اس کے مرنے کے بعد وہ دوسروں کے حجاج اور دست نگر نہ ہو جائیں اور اس کی دولت و سرمایہ ان کی آسائش و راحت پر اس طرح صرف ہو جس طرح اس کی زندگی میں صرف ہوتا رہا۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس نے ان کی ترقی اور کامیابی کے لئے جو کوششیں شروع کی ہیں وہ اس کے اس دُنیا سے اُٹھتے ہی ختم نہ ہو جائیں۔ اس کا کاروبار بند نہ ہو جائے۔ اس کے بچوں کی تعلیم کا سلسلہ منقطع نہ ہو جائے۔ ان کی ترقی کے امکانات مسدود نہ ہو جائیں

وہ اس نے ان کے لئے جس مکان کی تعمیر کا آغاز کیا ہے وہ ادھورا نہ رہ جائے۔ اس لئے اس کی دولت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اس کے بعد بھی اس کے یہ کام جاری رہیں۔ اس سے اس کی ایک فطری خواہش کی تکمیل ہوگی۔ اور وہ اس اطمینان کے ساتھ دنیا سے جائے گا کہ اس کی دولت اس کے جائز مستحقین ہی کے فلاح و بہبود پر صرف ہوگی۔ انسان کے عزیزوں کی فلاح و بہبود کا کام کسی ادارہ کے ذریعہ بھی انجام دیا جاسکتا لیکن اگر وہ خود اس کے لئے کسی کا انتخاب کرے — اور اسی کو فی الواقع اس کا حق ملنا بھی چاہئے — تو وہ اپنے عزیز و اقارب ہی کا انتخاب کرے گا۔ ان کے ہوتے ہوئے وہ کسی دوسرے شخص یا ادارہ کو جب تک کہ کوئی بڑی رکاوٹ نہ ہو، ترجیح نہیں دے سکتا۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے عزیزوں ہی کو اپنی دولت کا جائز حق دار سمجھتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کو اپنے خویش و اقارب پر جو اعتماد ہوتا ہے وہ دوسروں پر نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ اپنی دولت کو ان کے حوالہ کرتے ہوئے اطمینان محسوس کرتا ہے۔ تیسری وجہ خالص نفسیاتی ہے۔ جو کام اس کے عزیزوں اور قرابت داروں کے ذریعہ انجام پائے۔ اس کو وہ اپنا ہی کام تصور کرتا ہے۔ لیکن اگر یہی کام دوسرے انجام دیں تو وہ اس کو اپنا کام نہیں سمجھتا۔ بلکہ غیر متعلق لوگوں کا کام سمجھتا ہے۔ اس کے ادھورے کاموں کو اس کی اولاد اور اس کے بھائی بند جاری رکھیں تو یہ اس کے نزدیک اس کے اپنے ہی کاموں کا تسلسل ہوتا ہے لیکن اگر یہی کام دوسرے افراد انجام دیں تو اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے اپنے ہی کاموں کا تسلسل ٹوٹ گیا اور غیروں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ وراثت کی بنیاد انسان کا یہی فطری احساس ہے۔

وراثت کے تصور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کی نوعیت بالکل ایسی ہے۔ جیسے کسی کو راہ چلتے کوئی خزانہ ہاتھ آجائے۔ یا لاٹری میں کوئی چیز مل جائے۔ اس کا

تعلق آدمی کی محنت اور صلاحیت سے نہیں ہوتا بلکہ نجات و اتفاق سے ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک مالدار شخص کی اولاد لازماً مالدار ہوگی اور ایک غریب شخص کا بچہ غریب ہی ہوگا۔ حالانکہ غریب یا مال دار گھرانے میں پیدا ہونا محض ایک اتفاقی واقعہ ہے۔ کسی کا اختیاری عمل نہیں ہے۔

یہ اعتراض خائف پہلوؤں سے صحیح نہیں ہے

(۱)۔ اگر وراثت محض اس لئے قابلِ اعتراض ہے کہ وہ نجات و اتفاق سے ملتی ہے تو فی نفسہ یہ بات بھی قابلِ اعتراض ہونی چاہئے۔ کہ کوئی بچہ دولت مند گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے بے شمار سہولتوں کا مستحق ہو جائے۔ اور ایک مفلس خاندان کا بچہ ان سب سے محروم رہے جب کہ کسی بچہ کا غریب یا امیر گھرانے میں پیدا ہونا محض اتفاق ہی ہے۔

(۲)۔ وراثت کے بارے میں یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ وہ نجات و اتفاق ہی سے حاصل ہونے والی دولت ہے۔ ایک شخص کی دولت میں بالعموم اس کے بیوی بچوں، ماں باپ اور اہل خانہ کی کوششوں اور تعاون کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ تعاون کبھی روپیہ پیسہ، دوا دھوپ اور محنت کی شکل میں ہوتا ہے۔ اور کبھی محبت اور ہمدردی، ہمت افزائی اور غم گساری کی شکل میں ہوتا ہے۔ آدمی کو اپنے عزیزوں سے چاہے کھوس مادی تعاون حاصل نہ بھی ہو لیکن یہ اخلاقی تعاون ضرور حاصل ہوتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کم نہیں ہے بلکہ آدمی کی ترقی کے لئے یہ بہت ضروری ہے اس کے بغیر وہ آسانی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

(۳)۔ وراثت کا تعلق صرف مال و دولت ہی سے نہیں بلکہ اور بھی بہت سی چیزوں سے ہے۔ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنے ماں باپ اور خاندان والوں کی شکل و صورت، رنگ روپ اور قد و قامت بھی لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور ان کی ذہانت

اور کند ذہنی، ان کے اخلاق و عادات، ان کی قوتیں اور صلاحیتیں، ان کی کمزوریاں اور خوبیاں بھی اپنے ساتھ لاتا ہے۔ جس طرح یہ ایک طبعی حقیقت ہے کہ ایک ذہین اور باصلاحیت آدمی کی اولاد ذہین اور باصلاحیت ہوتی ہے۔ تندرست و توانا آدمی کے بچے تندرست و توانا پیدا ہوتے ہیں۔ مریض اور کمزور ماں باپ کی اولاد کمزور اور بیمار ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ ایک سماجی حقیقت ہے کہ دولت مند آدمی کے گھر پیدا ہونے والا دولت مند اور غریب شخص کا بچہ غریب ہوتا ہے۔ اگر یہ چیز نا پسندیدہ ہے تو سب سے پہلے غریب اور امارت کو مٹا کر تمام انسانوں کے درمیان کامل مساوات پیدا کرنی ہوگی جو شاید عملاً ممکن نہیں ہے۔ ایک شخص وراثت میں ملنے والی بے شمار خوبیوں کے ساتھ میدان میں آتا ہے۔ اور غیر معمولی کارنامے انجام دے جاتا ہے۔ جب تک اس کے کسی اقدام سے دوسروں کو نقصان نہ پہنچے اسے نہ تو ظلم کہا جاتا ہے اور نہ اس پر پابندی لگائی جاتی ہے۔ اس لئے یہ بڑی زیادتی ہوگی کہ کسی امیر گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے کو اس کے ماں باپ کی دولت سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ دی جائے جبکہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔

(۴)۔ وراثت میں ملنے والی دولت یا کسی امیر گھرانے میں پیدا ہونا ہی انسان کی ترقی کا واحد ذریعہ نہیں ہے۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ ایک شخص مادی سہولتوں کے نہ ہونے کے باوجود اعلیٰ مدارج پر پہنچ گیا۔ اور دوسرا شخص تمام آسائشوں کے ہوتے ہوئے بھی ترقی نہ کر سکا۔ اور زوال کا شکار ہو گیا۔ آدمی کی ترقی اور تنزلی یا بننے اور بگڑنے کا واحد سبب ماں باپ سے ملنے والا ورثہ ہی نہیں ہے بلکہ اس ورثہ سے زیادہ دوسرے عوامل اس میں کام کرتے ہیں۔

(۵)۔ وراثت قدرت کا ایک لچک دار قانون ہے۔ آدمی اپنے غم و حوصلہ جدوجہد، محنت اور ماحول کے تعاون سے جس طرح اپنی کمزوریوں کو دور کر سکتا اور

فطری صلاحیتوں کو جلادے سکتا ہے۔ اسی طرح اپنی خراب معاشی حالت کو بھی بدل سکتا ہے اور اپنی غفلت اور کوتاہی اور ماحول کے عدم تعاون سے جس طرح اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اسی طرح اپنی بہترین معاشی حالت کو بھی بگاڑ سکتا ہے۔ یہ دراصل ریاست اور پولیس معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسان کو صحیح رُخ پر لگائے۔ اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع فراہم کرے اور ایسے حالات پیدا کرے کہ وہ آسانی سے ترقی کر سکے۔

ان اسباب کی بنیاد پر اسلام آدمی کے مال و دولت کا اس کے اہل خاندان کو جائز وارث تصور کرتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ ہر شخص کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی تمام سہولتیں اور آسانیاں بھی فراہم کرتا ہے۔ ایک اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ داری قبول کرتی ہے کہ وہ انسان کے بنیادی حقوق کی حفاظت کرے گی۔ اور کسی بھی شخص کو اس حال میں نہیں چھوڑے گی کہ وہ کارخانہ اور جائیداد کا وارث نہ ہونے کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکے اور ترقی کی راہیں اس پر بند ہو جائیں۔ اسلام کے آنے سے پہلے عرب میں وراثت کا رواج تھا اور اس پر عمل بھی ہو رہا تھا لیکن اس میں بڑی نا انصافیاں اور بے اعتدالیاں پائی جاتی تھیں۔ اسلام نے ان سب کی اصلاح کی اور اس کو ایسی معتدل اور مبنی برانصاف شکل عطا کی کہ وہ ہر دور میں اور ہر سوسائٹی کے لئے موزوں ترین قانون بن گیا۔ اور اس میں ابدیت کی شان پیدا ہو گئی۔ اس قانون کو پوری طرح سمجھنے کے لئے پہلے عرب جاہلیت کے تصور وراثت کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس سے صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے اس میں کیا اصلاحات کیں۔ اس کے عدم توازن کو کس طرح توازن سے بدلا اور وقتی اثرات سے اس کو کیسے آزاد کر کے قیامت تک کے لئے ناقابل ترسیم و تفسیح بنا دیا۔

دور جاہلیت میں وراثت کی حسب ذیل بنیادیں تھیں

۱۔ حسب و نسب : انسان کے نسبی رشتہ دار اس کے وارث ہوتے تھے۔ لیکن نابالغ

لے۔ اس موضوع پر امام ابو جعفر صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ احکام القرآن ۱/۴۳۷-۴۳۸ ہم نے مزید

باقی حاشیہ ص ۹۳ پر

بچوں اور عورتوں کا وراثت میں کوئی حق نہیں تھا۔ چاہے وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ وراثت میں عمر کا خیال رکھا جاتا جو سب سے بڑا ہوتا وہ سب سے زیادہ وراثت کا مستحق ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔

لَا يَعْطَوْنَ الْمِيرَاثَ إِلَّا مَنْ قَاتَلَ لِيُطَوَّنَهُ
الْكَبِيرُ وَالْأَكْبَرُ
بٹے کو میراث دیتے اس کے بعد اس سے چھوٹے کا حق ہوتا۔
ابن زید کہتے ہیں۔

كَانَ النِّسَاءُ لَا يَرِثْنَ فِي الْمَجَاهِلِيَّةِ مِنْ
الْبَاءِ وَكَانَ الْكَبِيرُ يَرِثُ وَالْأَكْبَرُ وَالصَّغِيرُ
جاہلیت میں باپ کے مال میں عورت وارث نہیں
ہوتی تھی۔ بڑا بچہ وارث ہوتا اور چھوٹا وارث نہیں
ہوتا تھا۔

۲۔ دوسری بنیاد تھی تنبیت : اس کا مطلب ہے کسی دوسرے شخص کے بچہ کو
اپنا بچہ بنالینا۔ زوج کے رواج کے مطابق یہ بہت بڑا اقدام تھا اس لئے کہ جس بچہ کو اپنا یا
جاتا (متبئی) اس کو حقیقی اولاد کے حقوق حاصل ہو جاتے۔ وہ اسی شخص کی طرف منسوب
ہوتا جس نے اُسے اپنا بچہ بنایا ہے۔ اور اس کے مال و جائیداد کا بھی وہ وارث ہوتا۔ اسی طرح
متبئی کا انتقال ہو جاتا تو اس کا حقیقی باپ اس کا وارث نہ ہوتا بلکہ یہ مجازی باپ وارث ہوتا
حضرت عائشہؓ دور جاہلیت کی اس رسم کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

بقیہ حاشیہ ص ۹۲۔

تفصیلات اور ضروری باتوں کے حوالے دوسرے مآخذ سے بھی فراہم کر دئے ہیں۔

حاشیہ صفحہ ۹۲ :-

۱۔ ابن جریر : تفسیر ج ۳ / ۱۷۱۔ یہی روایت ابن کثیر نے ابن ابی حاتم سے بھی نقل کی ہے۔ تفسیر

۴۵۸ / ۱

۲۔ ابن جریر : تفسیر ج ۳ / ۱۷۳

وكان من تبنى رجلاً في الجاهلية
عاه الناس اليه وورث ميراثه
جاہلیت میں جو شخص کسی کو اپنا تبنی بنا لیتا تو لوگ
اُسے اسی کی طرف منسوب کرتے اور وہ اس کی

میراث کا وارث ہوتا۔

اسلام سے پہلے ہی کا یہ واقعہ ہے کہ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم - نے حضرت زید بن حارثہ رضی
کو اپنا تبنی بنایا تو کعبہ میں حجر اسود کے پاس انھیں لے گئے۔ اور وہاں جو لوگ موجود تھے ان کے
درمیان اعلان فرمایا

اشهد ان زيدا ابني يرثني وارثه
گواہ رہو کہ زید میرا بیٹا ہے۔ وہ میرا وارث ہوگا اور
میں اس کا وارث ہوں گا۔

چنانچہ اس کے بعد زید بن حارثہ - رضی اللہ عنہ - کو زید بن محمد - صلی اللہ علیہ وسلم - کہا جانے لگا۔
اسی طرح اسود بن عبد نفیث نے مقداد بن عمرو - رضی اللہ عنہما - کو اپنا تبنی بنایا تو وہ
مقداد بن اسود بن گئے۔

تیسری بنیاد تھی 'معاہدہ' اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ دو اجنبی اشخاص جن کے درمیان
کوئی خونی رشتہ نہیں ہوتا تھا۔ باہم ایک معاہدہ کے ذریعہ کچھ باتوں کے پابند ہو جاتے تھے۔
اس میں یہ بات بھی شامل ہوتی تھی کہ وہ ایک دوسرے کی وراثت میں کبھی حقدار ہوں گے۔ اس
معاہدہ کا سوسائٹی میں اعلان ہو جاتا اور جس کا بھی انتقال ہوتا اس کے خاندان کے لوگ اس
معاہدہ کا احترام کرتے۔ معاہدہ اسی قسم کا ہوتا تھا۔

دمی دمک و دھمی دھمک و ترقنی
میرا خون تمہارا خون ہوگا۔ میری قبر میں ہوگی جہاں
و ادثک و تطلب بی و اطلب بک سک
تمہاری قبر ہوگی تم میرے وارث ہو گے اور میں تمہارا
وارث ہوں گا۔ تم میرے خون (دیت) کا مطالبہ کرو گے
اور مجھے تمہارے خون (دیت) کے مطالبہ کا حق ہوگا۔

۱۔ بخاری کتاب النکاح، باب الاکفانی الدین۔ ابو داؤد، کتاب النکاح، باب من حرم بہ سک۔ ابن عبد البر، الاستیعاب
فی معرفة الاصحاب۔ تذکرہ زید بن حارثہ سک۔ حوالہ سابق۔ باقی حاشیہ ص ۹۵۔ پر ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جاہلیت میں اس طرح کے معاہدہ کی بنیاد پر آدمی چھٹے حصہ (۱/۶) کا حقدار ہوتا تھا۔

چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص (آزاد کردہ غلام) سے اس طرح کا معاہدہ کیا تو اس کے انتقال کے بعد اس کی وراثت میں آپ کو حصہ ملا۔ اسلام نے اپنی دعوت کے شروع میں عرب کے رسوم و رواج سے بالعموم تعرض نہیں کیا اور اپنی ساری قوت بگڑے ہوئے عقائد کو ٹھیک کرنے اور دین کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں صرف کیا۔ چنانچہ اسلام کے آنے کے بعد وراثت کے معاملہ میں بھی ایک عرصہ تک عرب کے طریقوں ہی پر عمل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ہجرت کا مرحلہ پیش آیا۔ اور وہ لوگ جو اسلام قبول کرنے کی وجہ سے طرح طرح کے ظلم و ستم برداشت کر رہے تھے۔ اپنے خویش و اقارب اور وطن کو چھوڑ کر مدینہ پہنچنے لگے۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ان مہاجرین کی آباد کاری کا تھا۔ اس کا حل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نکالا کہ مدینہ کی مسلم آبادی اور مہاجرین کے درمیان مواخات قائم کر دی۔ اور وہ ایک دوسرے کے بھائی بنائے گئے۔ یہ مواخات بڑے دور رس نتائج کی حامل تھی۔ اس کے نتیجے میں وہ ایک دوسرے کے وارث بھی قرار پائے۔

محمد بن زید کہتے ہیں۔

کان النبی قتل اخی بین المہاجرین والانصار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے شروع میں

(حاشیہ ص ۱۹) حصہ ۱/۲، مختلف راویوں نے معاہدہ کے جو الفاظ نقل کئے ہیں ان میں تھوڑی سی کمی بیشی پائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس میں خاص الفاظ کی پابندی نہیں کی جاتی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معاہدہ کے شرائط بدلتے رہتے ہوں لیکن حق وراثت غالباً معاہدہ میں ضرور شامل ہوتا۔ اس لئے کہ جو الفاظ نقل کئے گئے ہیں ان میں اس کا ذکر ہر جگہ موجود ہے۔ ملاحظہ ہو، ابن جریر ۳۲/۵، حاشیہ ص ۳۵، علی المتقی الہندی،

کنز العمال ۸۲/۱۱ - ۱۵ - حوالہ سابق ابن جریر ۳۲/۵ - حصہ ۱، احکام القرآن ۹۱/۲

اول ماكانت الحجۃ وكانوا على ذلك
مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کرادی تھی
اور وہ اس بنیاد پر ایک دوسرے کے وارث ہوئے تھے۔

یہ پس منظر تھا جس میں اسلام کا قانون وراثت نازل ہوا۔ اس نے یلکنت جاہلیت
کے تمام طریقوں کو منسوخ نہیں کیا بلکہ بتدریج ان میں اصلاح کی اور وراثت کے جو غلط
اور غیر فطری طریقے تھے۔ ان کو ختم کر کے صحیح اور بالکل فطری ضابطے وضع کئے۔

جاہلیت میں عورتوں اور چھوٹے بچوں کو اس لئے وراثت سے محروم رکھا جاتا تھا کہ
وہ کمزور اور دوسروں کے محتاج ہوتے ہیں۔ ان کی منطقی یہ تھی کہ وراثت کا حقدار وہی شخص ہو سکتا ہے
جو دشمن کا مقابلہ کر سکے اور جنگ میں اس سے مالِ غنیمت چھین سکے۔ عورتوں اور بچوں کیلئے
اپنی مدافعت بھی مشکل ہے۔ اودومروں کو ان کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے وہ وراثت کے
حقدار نہیں ہوتے تھے۔ ابن جریر جاہلیت کے اس دستور کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

ان اصل الجاہلیۃ كانوا لا یقسمون میراث
اہل جاہلیت مرنے والے کے وارثوں میں سے بچوں کو جو
المیت لاحد من وراثتہ بعد ما من كان لا
دشمن کا سامنا نہیں کرتے اور جنگ میں شریک نہیں ہوتے
یلاقى العدو ولا یقاتل فی المحروب من صفاد
تھے۔ اور عورتوں کو اس کی میراث میں سے حصہ نہیں دیتے تھے
ولہم لا النساء منهم وكانوا یخصمون بدلك
بلکہ خاص طور پر لڑنے والوں کو میراث دیا کرتے تھے بچوں
المقاتلۃ دون الذدیۃ
کو اس سے محروم رکھتے تھے۔

اسلام کے آنے کے بعد بھی ایک عرصہ تک عورت وراثت سے محروم رہی۔ اور بعض اوقات اس حکم
کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت بھی کی گئی۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ سعد بن ربیع
جنگِ احد میں شہید ہو گئے۔ تو انھوں نے جو مال چھوڑا تھا اسے اُن کے بھائی نے لے لیا۔ (اس لئے کہ ان
کے کوئی زریعہ اولاد نہیں تھی، حضرت سعد بن ربیع کی بیوی ان کی دو بچیوں کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اور عرض کیا حضو! آپ کو معلوم ہے کہ سعد شہید ہو گئے۔ یہ اُن کی

پچیاں ہیں۔ انھوں نے جو کچھ مال چھوڑا تھا۔ اس پر ان کے چچا نے قبضہ کر لیا۔ ان کی شادی کے لئے پیسہ چاہئے۔ اس کے بغیر شادی نہیں ہو سکتی۔ (اب بتائیے میں کیا کروں؟)۔ حدیث میں آتا ہے کہ اس کے بعد احکام میراث نازل ہوئے اور لڑکیوں کا حصہ متعین ہوا۔

اسی طرح اوس بن ثابتؓ کا انتقال ہوا تو ان کے پس ماندگان میں ان کی بیوی ایک کم سن لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ ان کی وراثت پر ان کے بھتیجوں نے قبضہ کر لیا۔ اور ان کے بیوی بچوں کو اس میں کوئی حصہ نہیں ملا۔ اوس ابن ثابتؓ کی بیوی نے ان کے بھتیجوں سے درخواست کی کہ وہ کم از کم ان لڑکیوں سے شادی کر لیں۔ لیکن چونکہ وہ خوبصورت نہیں تھیں اس لئے یہ دونوں اس کے لئے آمادہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو عرب کے دستور کے مطابق ان دونوں نے جواب دیا کہ یہ لوگ میراث کے مقدار کیسے ہو سکتے ہیں۔ جو نہ تو گھوڑے پر سوار ہو سکتے ہیں دشمن کا مقابلہ کر سکتے اور نہ کسی کا معاشی بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے بعد قرآن مجید کی آیت نازل ہوئی کہ آدمی کے مال میں مردوں اور عورتوں دونوں کا حصہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ جب تک تفصیلی احکام نہ آجائیں۔ وہ میراث میں سے کوئی چیز نہ لیں۔

زمانہ جاہلیت کا یہ طریقہ سراسر ظلم اور زیادتی پر مبنی تھا۔ یہ بات انسان کی عقل اور

۱۔ ترمذی : ابواب الفرائض ، باب ما جاز فی میراث البنات ، ابوداؤد ، کتاب الفرائض ، باب ما جاز فی میراث الصلب ابوداؤد کی ایک روایت میں سعد بن ربیع کی لڑکیوں کو ثابت بن قیس کی لڑکیاں کہا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ خود امام ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ ایک راوی حدیث بشر بن مفضل کی چوک ہے اس لئے کہ جنگ احد میں حضرت سعد بن ربیع شہید ہوئے تھے۔ اور ثابت بن قیس کی شہادت جنگ یمامہ میں ہوئی تھی۔

۲۔ اس واقعہ کی ایک تفصیلات میں بھی خود اس اختلاف ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ بغوی : معالم التنزیل تفسیر سورہ نساء آیت روح المعانی ۴/۲۱۰) دوسرے اس میں بھی اختلاف ہے کہ وہ کون شخص تھا جس (باقی حاشیہ ص ۹۸ پر)

اس کی ضرورت کے بالکل خلاف ہے کہ وراثت کے حقدار صرف مرد ہوں اور عورتیں نہ ہوں۔ لڑکے وراثت میں حصہ پائیں اور لڑکیوں کو حصہ نہ ملے، کم زور محروم رہیں۔ اور طاقت ور دوسرے کا بھی حق مار کھائیں۔ حالانکہ عقل کا صریح تقاضا یہ ہے کہ جو کمزور ہو اس کو ہمدردی اور تعاون کا زیادہ مستحق سمجھا جائے۔ اس کے حق کی زیادہ حفاظت کی جائے۔ اور اس کے ساتھ ظلم و زیادتی کو کسی حال میں روا نہ رکھا جائے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ماں باپ اپنی اولاد کے ساتھ اور خاندان کے سربراہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ اتنے بڑے ظلم کا ارتکاب کر رہے تھے اور اس کے خلاف کوئی ردِ عمل تو درکنار کوئی نفرت کا جذبہ بھی نہیں پایا جاتا تھا۔

اہل عرب کے نزدیک عورتوں اور بچوں کا وارث نہ ہونا اس قدر مسلم تھا کہ قرآن مجید میں

(بقیہ حاشیہ ص ۹۷)

کی وراثت زیر بحث تھی۔ اسی طرح کسی روایت میں کہا گیا ہے کہ مرنے والے کی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا کسی روایت میں تین لڑکیوں کا ذکر ہے۔ ابن جریر کی ایک روایت میں پانچ لڑکیاں بتائی گئی ہیں۔ (۴ / ۱۷۱)۔ ابن جریر کی ایک اور روایت میں شکایت کرنے والی خاتون کا نام "ام کجلہ" کہا گیا ہے۔ جس کی صرف ایک لڑکی تھی۔ ان کے شوہر ثعلبہ کے انتقال کے بعد ان کے بھائی یعنی لڑکی کے چچا نے وراثت پر قبضہ کر لیا تھا۔ (۴ / ۱۷۳) مرنے والے کے بھتیجیوں کے نام کہ روایت میں قتادہ، وعرفطہ اور کسی میں سوید وعرفطہ بتائے گئے ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ ابن حجر: الامساکن فی تمییز الصحابہ، تذکرہ اوس بن ثابت ۸۰/۱۔ نیز تذکرہ ام کجلہ ص ۸۸، ۸۹

حاشیہ صفحہ ہذا :

صاحبانیت کے ایک شخص عامر بن چشم کے بارے میں آتا ہے کہ اس نے اپنی لڑکی کو نہ صرف یہ کہ وراثت میں حصہ دیا بلکہ لڑکے اور لڑکی کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا۔ اور مساوات برتی۔ (ابن حجر: فتح الباری ۱۲ / ۱۱) یہ واقعہ جو یا اس نوعیت کا کوئی اور واقعہ ان کی حیثیت شاذ و نادر واقعات کی تھی۔ یہ کوئی عمومی ردِ عمل نہیں تھا۔

جب میراث کے احکام نازل ہوئے اور مردوں کے ساتھ عورتوں اور بچوں کے بھی حقوق بیان ہوئے تو بہت سے لوگوں کو تعجب ہوا کہ بیوی اور لڑکی بھی وارث ہونگی۔ اور چھوٹا بچہ بھی بڑے آدمی کی طرح وراثت میں حصہ دار ہوگا۔ حالانکہ ان میں سے کسی میں بھی دشمن کے مقابلے اور مال غنیمت حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔

قرآن مجید نے احکام میراث بیان کرنے اور قرابت داروں کے حقوق متعین کرنے سے پہلے ایک اصولی اعلان کیا۔ یہ اعلان بہت اہم تھا۔ اس نے دیر جاہلیت کے بہت سے ضابطوں کو ختم کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا :-

للرجال نصيب مما ترك الوالدان و
الاقربون، وللنساء نصيب مما ترك
الوالدان والاقربون مما قل منه او
کثر (النساء)

مردوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے اور عورتوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔

یہاں قرآن مجید نے عورتوں کے حق وراثت کا اتنے ہی اہتمام سے ذکر کیا ہے جتنے اہتمام سے مردوں کے حق کا ذکر کیا ہے۔ خاص بات دیکھنے کی یہ ہے کہ اس نے یہ نہیں کہا کہ والدین اور قرابت داروں کے مال میں مردوں اور عورتوں کا حق ہے بلکہ مردوں کے حق کو الگ سے بیان کیا اور عورتوں کے حق کا جدا گانہ ذکر کیا تاکہ دونوں کی انفرادیت باقی رہے۔ اور یہ معلوم ہو کہ مرنے والے کے مال میں جس طرح مردوں کا مستقل حق ہے اسی طرح عورتوں کا بھی مستقل حق ہے۔ ان میں سے کسی کا حق بھی کسی دوسرے کے حق کے تابع نہیں ہے۔ جو چیز جاہلی معاشرہ کا جزمین چلی تھی اس کو ختم کرنے کے لئے دونوں کے حقوق کو مستقل دفعات میں بیان کرنا ضروری تھا۔

اس کے ساتھ اس نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ مال تھوڑا ہو یا بہت

کم قیمت ہو یا بیش قیمت اس میں دونوں کا حصہ ہوگا۔ ایسا نہیں ہوگا کہ جائیداد، مکان، کارخانہ، قیمتی سازوسامان اور روپیہ پیسہ مرد کا ہو۔ اور کچھ بے قیمت چیزیں عورت کا حق سمجھی جائیں۔ بلکہ جو بھی مال ہے اور جس نوعیت کا بھی ہے۔ اس میں دونوں کا حق ہوگا۔ اور خدا کی ہدایت کے مطابق وہ ان کے درمیان تقسیم ہوگا۔ آخر میں فرمایا کہ عورت اور مرد کے حقیقی خدا کی طرف سے متعین کر دئے گئے ہیں۔ جو بہر حال ان کو پہنچنے چاہئیں۔ ان میں سے کوئی فرد کسی کو نہ تو محروم کر سکتا ہے اور نہ اس کے حق پر قبضہ کر سکتا ہے۔

اس کے بعد قرآن مجید نے مردوں، عورتوں، لڑکوں اور لڑکیوں سب ہی کے حقوق وراثت تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے۔
 یٰٰوِصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْ اَوْلَادِکُمْ اللّٰہ تعالیٰ تم کو تمہاری اولاد کے معاملہ میں وصیت کرتا ہے
 اللّٰہ تعالیٰ جب کسی کام کی وصیت کرتا ہے تو اس کے معنی یہی نہیں ہوتے کہ وہ اس کی انجام دہی کی نصیحت کرتا ہے بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ اس کام کا حکم دے رہا ہے اس کی ضرورت تاکید کر رہا ہے۔ اور اسکو پورا کرنے کا بندہ سے عہد و پیمان لے رہا ہے۔

’اولاد کے لفظ میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں۔ چاہے وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، امیر ہوں یا غریب، عالم ہوں یا جاہل، اس لئے کہ اولاد بہر حال اولاد ہے اور والدین سے یکساں تعلق رکھتی ہے۔ ان میں تفریق صحیح نہیں ہے۔ ابن جریر

رحمہ اللہ۔ ’وصیت کے معنی امام رغبہ اصفہانی نے ان الفاظ میں بیان کئے ہیں۔ ’ان یقدم الی الفیئہ ما یعمل فیہ مقتضیاً یوعظ (مفردات القرآن) یعنی نصیحت کے انداز میں کسی کو ایسی بات بتانا جس پر عمل کرے۔ مجدالدین فیروز آبادی کہتے ہیں۔ ’اوصاہ ووصاہ توصیۃ، عہد الیہ و یوِصِیْکُمُ اللّٰہُ اِیْ یُقْرِضْ عَلَیْکُمْ (قاموس ماوہ وئی) ’اوصاہ‘ اور ’وصاہ‘ کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اس سے عہد لیا اور اس کو اس کا پابند بنایا۔ ’یوِصِیْکُمُ اللّٰہُ‘ کا مطلب ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ تم پر فرض کرتا ہے۔

کہتے ہیں۔ ^{یہ} اس حکم میں مرنے والے کے بچے چھوٹے ہوں یا
سواء فیہ صغار ولدہ وکبارہ وانا ہم بڑے یا وہ لڑکیاں ہوں۔ سب برابر ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے اور اس کی پابندی کی تاکید کرتا ہے کہ تم اپنی اولاد کے درمیان کسی قسم کا فرق نہ کرو۔ اور ان میں سے ہر ایک کو اس کا حق ادا کرو۔ اولاد کے بارے میں والدین کو وصیت کر کے اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ انسان اپنے بچوں کے ساتھ بھی زیادتی کر سکتا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ اس نے زیادتی کی بھی ہے۔ لیکن خدائے تعالیٰ کی ذات عدل و انصاف کا سرچشمہ ہے وہ انسان پر اس سے زیادہ مہربان ہے جتنا ماں باپ اپنے بچے پر ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ اس لئے اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ ماں باپ کو بھی اپنی اولاد کے ساتھ عدل و انصاف کا حکم دے اور ان کو نا انصافی سے منع کرے۔ یہی بات مشہور سیرت نگار سمیعی نے ان الفاظ میں کہی ہے۔

اضاف الاولاد الیہم مع ائہ الذی اوصی بہم اشارۃ الی ائہ ارحم بہم من آبائہم
اللہ تعالیٰ نے اولاد کو ان کے (آباء) کی طرف منسوب کیا، لیکن اس کے ساتھ اس نے ان کے بارے میں انصاف کی ان کو وصیت کی۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ ان کے آباء سے زیادہ ان پر مہربان ہے۔

(باقی)

۱۔ طبری: تفسیر ۱۴۱/۲

۲۔ ابن حجر: فتح الباری ۲/۱۱